تحریک اسلامی کا ایک گمشدہ باب؛

قیامِ دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کی روداد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ایک تحریر

جو انکی وفات کے بعد شائع ہوئی

(بشکریہ ماہنامہ "فاران" کراچی و ہفت روزہ "ایشیا" لاہور)

مرتبہ: جناب محمد یوسف صاحب

الجہاد فی الاسلام کی اشاعت کے بعد مودودی کی زندگی میں ایک عظیم تغیر پیدا ہوا ان کی یہ اولین معرکۃ الآرا تصنیف مولانا محمد علی جوہر کی دلدوز آہ کا نتیجہ تھی۔ سید مودودی نے اس کے بعد اپنی زندگی کلیۃً خدمت اسلام کے لیے وقف کر دی "الجمعیۃ" کی ادارت کو خیرباد کہا، چند ماہ بھوپال میں اپنے بڑے بھائی ابو محمد مودودی مرحوم کے پاس رہے اور یہ پورا عرصہ بھوپال کی سرکاری لائبریری سے استفادے میں گزارا، پھر مستقل طور پر حیدرآباد (دکن) منتقل ہو گئے۔

۱۹۳۲ء میں سر سالار جنگ کی خواہش پر جنوبی ہند میں تبلیغ اسلام کے لیے ایک سکیم پیش کی جس پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۲ء میں رسالہ "ترجمان القرآن" مولانا ابو محمد مصلح سے لے لیا۔ اور اس کو اپنے مشن کی توضیح و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اسی ماہنامے کی وساطت سے چودھری نیاز علی خاں مرحوم سید مودودی سے واقف ہوئے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ علامہ اقبالؒ پہلے ہی الجہاد فی الاسلام کے ذریعہ سید مودودی اور ان کے مشن سے مانوس ہو چکے تھے۔ چودھری نیاز علی جب اقبالؒ سے دوبارہ ملے اور ان کو سید مودودیؒ کے خطوط دکھائے تو علامہ نے مجوزہ دارالاسلام کی سربراہی کے لیے (جس کا وقف نامہ خود علامہ نے تیار کیا تھا) ان سے مراسلت کی ابتدا کی۔ علامہ کی خرابی صحت اور کمزوری بصارت کی وجہ سے یہ خط و

کتابت نذیر نیازی مرحوم کے ذریعے ہوئی۔ سید مودودی نے حضرت علامہ کے خطوط کے جواب میں جو مکتوبات اقبال کو لکھے ان کی نقول سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علامہ سکیم دارالاسلام کی سربراہی کے علاوہ سید مودودی سے اپنی مجوزہ کتاب "عمرانیات اسلامی کی تشکیل جدید" کی ترتیب و تالیف میں نیز قادیانیت کے خلاف بھی کام لینا چاہتے تھے۔ ذیل کے دو فقرے اسی کے غماز ہیں۔

۱ علامہ اقبال کے ساتھ "عمرانیات اسلامی کی تشکیل جدید" میں حصہ لینا میرے لیے موجب سعادت ہے میں ہر ممکن خدمت کیلئے حاضر ہوں مگر اس سلسلے میں کسی مالی معاوضہ کی ضرورت نہیں۔

مکتوب مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء

۲ .... آئندہ رجب کے آخر میں سفر کا ارادہ ہے۔ چار پانچ روز دہلی ٹھہر کر غالباً ختم رجب یا آغاز شعبان میں لاہور پہنچوں گا۔ اس موقع پر یہ بھی طے ہو جائے گا کہ قادیانیت کے متعلق مجھے کیا لکھنا چاہیے۔"

(مکتوب مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۳۷ء)

اس خط و کتابت کے بعد سید مودودی ستمبر ۱۹۳۷ء میں لاہور گئے اور چودھری نیاز علی کے ہمراہ حضرت علامہ سے تین طویل ملاقاتوں میں اسکیم دارالاسلام کے منصوبہ کی تکمیل و صورت گری کی اور پھر ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو مستقل طور پر پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ حضرت علامہ مولانا مرحوم کی لاہور آمد کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔ سید نذیر نیازی سے خط بھی لکھوایا تھا کہ جلد ہو پہنچیں۔ سید نذیر نیازی اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ "۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ نے ان سے دریافت کیا کہ خط کا جواب آیا یا نہیں اور کب مولانا مودودی پہنچ رہے ہیں۔ لکھتے ہیں جواب پا کر وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کے چہرے پر افسردگی کا سایہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس طلبی کی تصدیق سید مودودی کے تعزیت نامے سے ہوتی ہے جو ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھا گیا۔

"میں اپنے وعدے کے مطابق آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک علامہ کے انتقال کی خبر پہنچی دفعۃً دل بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ رنج مجھے اس بنا پر ہوا کہ کتنا قیمتی موقع میں نے کھو دیا۔ آپ کے عنایت نامہ سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ وقت اس قدر قریب آگیا ہے اگر معلوم ہوتا تو سب کام چھوڑ کر فوراً پہنچتا۔ میں اس کو اپنی انتہائی بد نصیبی سمجھتا ہوں کہ اس شخص کی آخری زیارت سے محروم رہ گیا جس کا مثل شاید اب ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں ....

.... مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال کی ذات تھی میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے ....

....

.... برادرم آپ آخری وقت تک علامہ کے ساتھ رہے اگر میری ہدایت کے لیے انہوں نے کچھ فرمایا ہو تو مجھے ضرور اس سے مطلع کریں۔

بالآخر سید مودودی ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو پٹھان کوٹ پہنچے اور سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ دارالاسلام سکیم کو روبہ عمل لانا تھا چنانچہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو وقف کمیٹی کے ارکان کا اجلاس ہوا جس میں سید مودودی نے اپنا وہ تحریری بیان پیش کیا جو ذیل میں دیا جا رہا ہے یہ بیان ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو وقف کمیٹی کے سامنے پڑھا گیا۔ کمیٹی کے حسب ذیل ارکان موجود تھے

۱۔ خان صاحب شیخ محمد نقیب صاحب
۲۔ مولوی رحمت علی صاحب
۳ جناب محمد اسد صاحب (علامہ محمد اسد)
۴ جناب چودہری نیاز علی خان صاحب
۵ ابوالاعلیٰ مودودی

اس بیان کے ساتھ مولانا کا نوٹ ہے "کمیٹی نے بالاتفاق میری پیش کردہ تین صورتوں میں سے پہلی صورت کو پسند کیا اور مجھ سے خواہش کی کہ اس کے مطابق ریزولیوشن مرتب کردوں تاکہ کمیٹی اسے باقاعدہ منظور کرے چنانچہ میں نے وہ ریزولیوشن مرتب کیا جو اس بیان کے ساتھ ملحق ہے"

یہ ایک نایاب دستاویز ہے جو اس سے قبل منظر عام پر نہ آئی تھی۔

ابوالاعلیٰ

قبل اس کے کہ دارالاسلام کے نظم و نسق کو صحیح اصول پر قائم کرنے اور چلانے کے متعلق میں اپنی تجاویز آپ کے سامنے پیش کروں، میں چاہتا ہوں کہ اس کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے بیان کر دوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ تخیل کس طرح پیدا ہوا، اپنے نشوونما کے کن مراحل سے گزر کر اب کہاں تک پہنچا ہے، اور میں کس خیال کے تحت حیدرآباد سے یہاں آیا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں پانچ سال سے رسالہ ترجمان القرآن شائع کر رہا ہوں اس رسالہ کی اشاعت محض اس غرض سے نہ تھی کہ میں ایک رسالہ نکالنا چاہتا تھا بلکہ دراصل کامل ۱۵ سال تک مسلمانوں کی قومی زندگی سے متعلق رہنے اور ذاتی تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور غور و خوض کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کا بگڑنا اور پیہم رُو بہ زوال ہونا، براہ راست نتیجہ ہے اپنی تہذیب کی اصل بنیاد سے ہٹ جانے کا اور اب ان کی اصلاح حال کے لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی کو، فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے، اسی اصل بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسی غرض کے لیے میں اس قسم کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ جس کا خاکہ میں ابھی آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن ایسے ادارہ کو قائم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے میں وہ خیالات لوگوں میں پھیلاؤں جو میرے قلب و دماغ میں مرتکز ہو رہے ہیں اور جب ایک کافی مدت تک وہ پھیلتے رہیں اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جن کا تخیل اور نصب العین میرے تخیل اور نصب العین سے متحد ہو، تو پھر ان کو ایک مرکز کی طرف دعوت دی جائے اور اس نظام کو وجود میں لایا جائے جسے میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔

اس مقصد کے تحت میں نے ترجمان القرآن شائع کرنا شروع کیا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ میں نے رسالہ جاری نہیں کیا تھا بلکہ دراصل اپنے کام کی مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک جال پھیلایا

تھا اس کے ساتھ ہی میں نے ایک تجارتی کام بھی شروع کر دیا تھا، تاکہ اپنے پیشِ نظر مرکز کی تعمیر کے لیے زمین تیار کرنے میں جب تک مجھے کامیابی نصیب ہو اس وقت تک یہ کام فروغ پا کر اس قابل ہو جائے کہ اس کے مرکز کے مصارف سہار سکے اور مجھے کم از کم اس کے قائم کرنے میں کسی سے مدد نہ لینی پڑے۔ کیونکہ میں اپنے زمانہ کے ذی استطاعت اور صاحبِ حیثیت مسلمانوں کی ذہنیت کا کافی تجربہ رکھتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ اگر کسی نیک جذبہ کے تحت بھی یہ لوگ کسی کام پر روپیہ صرف کرتے ہیں تو ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کام کی ہدایت و رہنمائی بھی وہ خود ہی کریں۔ بلا لحاظ اس کے کہ ان میں رہنمائی کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر میں نے ابتدا سے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس عمارت کو میں اپنے بل بوتے پر خود اپنے نقشہ کے مطابق بناؤں گا اور بعد میں جو لوگ میری مالی مدد کرنا چاہیں گے ان کی مدد واضح طور پر صرف اس شرط کے ساتھ قبول کر دں گا کہ وہ تعمیر کے کام میں دخل نہ دیں۔ میں نے اسی نصب العین کے تحت حیدر آباد میں ایک زمین بھی خرید لی تھی، جہاں میں اپنے ادارہ کی عمارت بنانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا اسی دوران میں کہ میں اپنی راہ پر چل رہا تھا، یکایک میرے راستے میں ایک چیز آگئی جس نے بالآخر مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ جناب چودھری نیاز علی خان صاحب کا خط تھا جو اگست ۱۹۳۵ء میں مجھے وصول ہوا۔ اس میں چودھری صاحب نے کسی کارِ خیر کے لیے ایک معقول جائداد وقف کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا اور مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ اس کو کس کام کے لیے وقف کیا جائے اس کے جواب میں میں نے اپنے وہی خیالات ان کو لکھ کر بھیج دیئے۔ جن کے لیے میں خود کام کر رہا تھا چنانچہ میں نے اپنے ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء کے خط میں انہیں لکھا کہ :-

"صوفیائے اسلام نے قدیم زمانے میں ایک خاص قسم کا ادارہ قائم کیا تھا جو اصحابِ الصفہ کے نمونے پر تھا اس کا اصطلاحی نام خانقاہ مشہور ہے آج یہ چیز بگڑ کر اتنی بدنما ہو گئی کہ خانقاہ کا نام سنتے ہی طبیعت اس سے منحرف ہونے لگتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ایک بہترین انسٹی ٹیوشن تھا جس سے اسلام میں بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس قدیم انسٹی ٹیوشن میں وقت اور زمانے کے لحاظ سے ترمیم کر کے از سرِ نو جان ڈالی جائے۔ اور ہندوستان میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ایسی قائم کی جائیں جن میں فارغ التحصیل لوگوں کو کچھ عرصہ تک رکھ کر اسلام کے متعلق نہایت صالح لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے اور ان کے ساتھ وہاں ایسا ماحول ہو جس میں زندگی بسر کرنے سے ان کی سیرت خالص اسلامی رنگ میں رنگ جائے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں کلب، لائبریری

اکیڈمی اور آشرم کی تمام خصوصیات جمع ہونی چاہیں اور اس کا صدر ایسا ہونا چاہیئے
جو نہ صرف ایک وسیع النظر اور روشن خیال عالم ہو بلکہ اسکے ساتھ ساتھ ایک سچا
اور مکمل عملی مسلمان بھی ہو، تاکہ اس کی صحبت سے خانقاہ کے ارکان کی زندگیاں اسلامی
سانچہ میں ڈھل جائیں۔ اس تمام اسکیم کا انحصار شیخ کے انتخاب پر ہے۔ کم از کم
معروف اور نمایاں لوگوں میں تو مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں تمام شرائط محقق ہوں
اگر آپ اس کام کو کرنا ہی چاہتے ہیں تو ایک مرتبہ ہندوستان کا دورہ کیجئے شاید کسی
گوشہ میں کوئی عالم باعمل آپ کو مل جائے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ چودھری صاحب کا ضمیر بھی وہی چیز مانگ رہا تھا جو میں نے ان کے سامنے پیش
کی تھی چنانچہ یہ خیال ان کے دل میں گھر کر گیا، اور اسکے تعاقب میں انہوں نے عمل شروع کر دیا اسکے
کئی مہینے بعد ۵ر اپریل ۱۹۳۶ء کو دوسرا خط میرے نام آیا جس میں انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ وقف نامہ
رجسٹرڈ کرادیا گیا ہے اور عمارت کی تیاری بھی شروع ہو گئی ہے لیکن تلاشِ شیخ کے متعلق انہوں نے لکھا
کہ :-

"جناب نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں ایسے بزرگ کی تلاش میں ہندوستان کا چکر لگاؤں
بھلا ایسی جنس اس طرح پر بھی کہیں مل سکتی ہے .... اور یہ کام اگر مجھے ہی کرنا
ہے تو میں آپ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ جناب اس درس گاہ یا خانقاہ کو خود ہی کیوں
نہیں سنبھالتے۔ اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" کو اس جگہ جاری رکھیئے۔

اس عنایت نامہ کا جو جواب ۲۳ر اپریل ۱۹۳۶ء کو میں نے دیا، وہ یہ تھا۔

" میرے حالات یہ ہیں کہ میں نے کئی سال قبل وہی اسکیم سوچی تھی جو آپ کے سامنے پیش
کر چکا ہوں اس اسکیم کی ابتداء "ترجمان القرآن" کے اجراء سے کی۔ اسکے بعد مالی مسئلہ کو
حل کرنے کے لیے رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک "تجارتی کام" شروع کیا۔
جو اب خدا کے فضل سے کامیابی کے قریب ہے .... اس میں کامیاب ہونے
کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں خود اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک مختصر جماعت کو منتخب کروں گا
اور اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا، ایسی صورت میں میرے لیے تو
حیدرآباد کو چھوڑنا بہت مشکل ہے اور آپ بھی اس کو پسند نہ فرمائیں گے۔ لیکن مشورہ دل
کی حد تک میں آپ کو ہر قسم کی مدد دینے کے لیے حاضر ہوں۔ اس قسم کے بہت سے

مرکز ہندوستان میں قائم کرنے کی ضرورت ہے اور ان میں اتحادِ مقصد اور اتحادِ خیال کے ساتھ باہمی معاونت بھی ہو تو اس سے بہتر نتائج پیدا ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔"

اس کے بعد یہ سوال تو خارج از بحث ہو گیا کہ میں یہاں آکر کام کروں گا۔ البتہ اس امر کی ذمہ داری میں نے قبول کی کہ ادارہ کو چلانے کے لیے کام کا نقشہ میں بناؤں گا۔ چنانچہ مختلف اوقات پر میں نے اپنے خطوط میں تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات چودھری صاحب کو لکھتا رہا۔

۴ ستمبر ۱۹۳۶ء۔

۱۔ سب سے بڑی چیز جس کی اس وقت کی نظر آرہی ہے صحیح اسلامی تربیت ہے۔ جدید مدارس تو خیر انگریزی اغراض کے لیے قائم ہوئے ہیں مگر ہمارے قدیم مدارس اور قومی ادارے بھی اس باب میں ناقص ہیں۔ خانقاہ میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں شیخ اور مرید (یہ الفاظ میں مجبوراً ادا کر رہا ہوں۔ اصطلاحی مفہوم مراد نہیں ہے) دونوں اپنی اصلاح کریں، اور ایک دوسرے کی تربیت کریں، اور باہر کا جتنا رنگ ہر ایک پر کم یا زیادہ چڑھ گیا ہے، اسکو سب مل کر ایک دوسرے پر سے کھرچیں اور آپس کی معاونت سے ایک دوسرے میں خالص اسلامی سیرت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ وہاں احتساب نفس پہلے ہو پھر النصح للہ کے اصول پر عمل کیا جائے اور پھر مداہنت سے پرہیز کیا جائے۔ صحابہ کرام اور اکابرِ اسلام کی زندگیاں پیش نظر رکھنی چاہئیں اور خصوصیت کے ساتھ ان طریقوں کی پیروی کی جائے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تربیت فرمائی تھی۔

۲۔ جو اصحاب ادارہ میں داخل ہوں ابتداءً ان کو کم از کم دو سال تک شہری زندگی میں واپس جانے سے روک دیا جائے بلکہ ادارے کی باہر کی دنیا سے ان کا جسمانی تعلق قریب قریب منقطع کر دیا جائے تاکہ اس مدت میں ان پر گہرا رنگ چڑھ جائے۔ اور وہ اتنے پختہ ہو جائیں کہ اگر دوسروں پر اپنا رنگ نہ چڑھا سکیں تو کم از کم دوسروں کا رنگ قبول بھی نہ کریں۔

۳۔ زندگی میں پوری سادگی ہو۔ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ جسمانی مشقت کے لیے ایک قطعہ زمین ایسا مقرر کیا جائے جس میں "شیخ اور مرید" سب اپنے ہاتھوں سے

باغبانی یا ترکاریوں کی کاشت کریں۔ صفائی اور حفظان صحت اور تغذیہ کے بالکل جدید ترین اصولوں کی پابندی کی جائے۔ "خذما صفا ودع ماکدر" کے اصول پر مغربی زندگی کی تمام وہ چیزیں لی جائیں جو مفید ہوں اور پرہیز صرف ان چیزوں سے کیا جائے جو زہریلی ہیں۔

۴۔ سپاہیانہ فضائل پیدا کرنے کے لیے فوجی ڈسپلن کا رنگ اختیار کیا جائے۔ ضبط اوقات اور باقاعدہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی جائے اور اس کے ساتھ ورزشوں میں سے خاص طور پر گھوڑے کی سواری، تلوار کا استعمال، لکڑی کے فنون اور نشانہ بازی کی مشق کا صبح وشام کے اوقات میں التزام کیا جائے۔

۵۔ نماز اور روزے کی سخت پابندی ہونی چاہیے اس کے ساتھ انتہائی کوشش کی جائے کہ اوامر کا اتباع اور نواہی سے اجتناب کیا جائے اور یہ پابندئ شریعت مجبوراً نہ ہو۔ بلکہ بطوع و رغبت خود اپنے نفس کے میلان سے ہو۔ ادارہ کی اصل خوبی یہی ہونی چاہیئے کہ وہاں کی آب و ہوا میں اسلامیت کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ نیکیاں خود بخود نشو و نما پانے لگیں اور شر و بد عصیان کے بیج خود بخود جل جائیں۔

۶۔ ادارہ میں سر دست صرف اتنے آدمیوں کو شریک کیا جائے جن کو آپ کی جائیداد موقوفہ باآسانی سہارا دے سکتی ہو۔ خواہ ان کا پورا بار وقف پر ہو یا کسی حد تک وہ اپنا بار آپ سنبھالنے والے ہوں۔ دو تین سال کی تربیت کے بعد ایسا انتظام کیا جائے کہ ادارہ کے ارکان باہم مل کر تجارتی اصول پر کوئی پریس اور دارالاشاعت چلائیں اور نہ صرف اپنا بار خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں۔ بلکہ اپنے ادارے میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنے اور اسی طریق پر ان کی تربیت کرنے کے بھی قابل ہو جائیں۔

۷۔ اگر کوئی شخص برضا و رغبت ادارے کی مالی مدد کرے تو اسے قبول کر لیا جائے لیکن کبھی خود کسی سے مدد نہ مانگی جائے اور نہ عطایا وصول کرنے کو ادارہ کے پروگرام کا ایک شعبہ بنایا جائے۔

۸۔ ادارہ کے تمام لوگ ایسے ہوں جو انگریزی یا عربی درسگاہوں سے فارغ ہو چکے ہوں یا جن کی علمی استعداد اعلیٰ درجہ کی ہو۔ جن میں کوئی ذہانت، کوئی اپچ، کوئی جوہر مخفی پایا جاتا ہو۔ ان امور کی تحقیق کے لیے امیدواروں کو ادارہ کا باقاعدہ رکن بنانے سے پہلے دو مہینے کے لیے ادارہ میں بلا کر رکھا جائے اور غیر محسوس طریقہ پر ان کو خوب جانچ کر دیکھا جائے۔

"موہیت" اور فرنگیت سے خصوصاً پرہیز ضروری ہے۔

۹۔ ادارہ میں باقاعدہ درس و تدریس کی ضرورت نہیں عربی جاننے والے فرداً فرداً انگریزی جاننے والوں کو عربی پڑھائیں اور علوم اسلامیہ کی تعلیم دیں اور اسی طرح انگریزی تعلیم یافتہ حضرات عربی دانوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم دیں ایک وقت ایسا ہو جس میں "شیخ" قرآن کا درس دے یہ درس اس انداز میں ہو کہ شیخ سمیت ہر شخص معلم بھی ہو اور متعلم بھی ہو۔ ہر شخص پہلے سے زیر درس آیت یا آیات کی تفسیر میں کافی غور و خوض اور تحقیق و مطالعہ کر کے شریک درس ہو اور درس کے موقعہ پر اپنی تحقیق بیان کرے۔ اور دوسروں سے استفادہ کرے یہ ایسا جامع درس ہونا چاہیئے کہ اس کے ضمن میں حدیث، فقہ، حکمت اسلامیہ، اصول شرع، فلسفہ، تاریخ اسلامی، غرض دنیا بھر کے مباحث و مسائل آسکتے ہوں۔ درس قرآن کے بعد تمام ارکان کو مطالعہ اور تحقیق میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔ یہ کام سب سے زیادہ اہم اور نازک ہے۔ اور شیخ کی "حکمت" کا سب سے بڑا مصرف یہی ہے اولاً اس کو یہ طے کرنا چاہیئے کہ سردست کن کن شعبوں میں تحقیق کا کام شروع کیا جا سکتا ہے ثانیاً یہ کہ کون کونسے ارکان کس کس شعبے کے لیے موزوں ہیں۔ ثالثاً یہ کہ ان کی راہنمائی کس ڈھنگ سے کی جائے اور ہر شعبہ میں تحقیق کی لائن اور اس کا نصب العین کیا ہو۔

میری رائے میں سردست تین چار شعبے خاص طور پر توجہ کے محتاج ہیں۔

۱ فقہ۔
۲ معاشیات۔
۳ علوم عمران۔
۴ فلسفہ اور نظری سائنس۔

یہ سب علمی اور تحقیقی کام اس بنیادی نظریہ کے ساتھ کیا جائے کہ قرآن و سنت ہی علم کا اصل منبع ہے سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے اور اس نظام شمسی میں ہر چیز کو اسی آفتاب کے گرد گھومنا ہے اس مرکز سے منحرف جو چیز ہو اس کے لیے اس نظام میں کوئی جگہ نہیں۔

۱۰۔ ادارہ کی تعلیم و تربیت سے جب ایک جماعت پوری طرح تیار ہو جائے تو اشاعت کا کام شروع کیا جائے۔ اشاعت کے لیے تین زبانوں کا انتخاب میری رائے میں مناسب ہے۔ عربی انگریزی اور اردو۔ اشاعت زیادہ تر رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہونی چاہیے اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خیالات اور عملی طریقوں کی اصلاح کے لیے "ٹریکٹس" کی اشاعت بھی شروع

کی جائے۔ جدید نیم مختار کونسلوں سے مجھے ایک فتنہ اٹھتا نظر آتا ہے بکثرت جہلا مسلمانوں کی طرف سے نمائندے بن کر کونسلوں میں جائیں گے اور سوشل ریفارم کے نام سے "سوشل ڈیفام" کریں گے اور جدید قوانین بنا کر مسلمانوں کے پرسنل لا کو اور زیادہ مسخ کریں گے اس وقت علماء کے شور و غل مچانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ یہ لوگ چھ سو برس پہلے کی دنیا میں رہتے ہیں ایسے موقع پر صرف ماڈرن علماء ہی کام آسکیں گے وہ اس زمانے کی زبان میں اسلامی قوانین کی صحیح تعبیر پیش کریں گے، اور قانون سازوں کو بتائیں گے کہ سوشل ریفارم کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کونسی ہے۔"

"۱۳ محرم ۵۶ھ ۲۶ مارچ ۱۹۳۷ء"

یہ کام بالکل نیا ہے اور ماضی و حال دونوں میں اسکے لیے پہلے سے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے اس لیے نتیجہ کو اکثر لوگ مشکوک ہی پائیں گے اور خود آپکو بھی اس کے لیے صحیح راستہ متعین کرنے میں دقتیں پیش آئیں گی مگر چونکہ مقصود بالکل واضح طور پر ہمارے سامنے متعین ہو چکا ہے۔ اس لیے تمام مشکلات کے باوجود سیدھا راستہ ہم کو ضرور مل جائے گا۔

ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ جدیدہ (Renaissance) چاہتے ہیں۔ قرآن کی اسپرٹ اور اسلام کے اصول ہمارے نزدیک غیر متبدل ہیں مگر افکار اور معلومات کی ترتیب اور عملی زندگی کے احوال پر اس روح اور ان اصولوں کا انطباق ہمیشہ احوال کے تغیر اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہے متقدمین اسلام اس چیز کو سمجھتے تھے انہوں نے اپنے زمانے میں عملاً اسکو برتا۔ مگر متاخرین یہ سمجھے کہ اصول اور اسپرٹ کی طرح ان کا انطباق بھی غیر متبدل ہے اسی چیز نے وہ جمود پیدا کیا جو سات سو برس پہلے سے ہمارے علوم اور ہمارے قوانین حیات پر طاری ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس جمود کو توڑنا چاہا، مگر انہوں نے جو نشاۃ جدیدہ پیدا کرنا چاہی وہ اسلام کی نشاۃ جدیدہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ روح قرآنی اور اصول اسلامی سے بے بہرہ ہیں ان کی فکر و نظر اسلامی نہیں ہے اس لیے نہ وہ مسلمانوں کی حیثیت سے سوچ سکتے ہیں نہ اسلامی طریق پر معلومات کو مرتب کر سکتے ہیں نہ زندگی کے معاملات کو مسلمان کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں ہمارا راستہ متاخرین اور متفرنجین دونوں کے راستے سے الگ ہے ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا ہے اور اپنی قوت فکر و نظر کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد

(IDENTIFY) کرتا ہے۔ دوسری طرف علم کی اُن ترقیات اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا جائزہ لیتا ہے جو گذشتہ آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں۔ اور تیسری طرف اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب، اور قوانینِ حیات کو مدون کرتا ہے تاکہ اسلام پھر سے بالفعل ایک قوت (DYNAMIC FORCE) بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کی بجائے مقتدا اور امام بن کر رہے۔

یہ ایک (Herculean Task) ہے اوّل تو ہم اسکو اسطرح شروع کر رہے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اسکے نشاناتِ راہ چھوڑ کر نہیں گیا ہے ہمیں خود ہی اپنی منزلِ مقصود کو پیشِ نظر رکھ کر راستہ بنانا ہے اور اسپر چلنا ہے دوسرے یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری اور آپکی اور ہم جیسے سینکڑوں آدمیوں کی پوری پوری زندگیاں بھی اسکے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ امید کریں کہ ہماری زندگی میں اس کے پورے نتائج سامنے آجائیں گے تو یہ غلط امید ہوگی۔ یہ کھجور کا درخت لگانا ہے جو اسکو بوتا ہے وہ اس کے پھل نہیں توڑ سکتا۔ ہم اس درخت کو لگائیں گے اور اپنے خونِ جگر سے اسکو سینچ کر چلے جائیں گے۔ ہمارے بعد دوسری نسل آئے گی۔ اور شاید وہ بھی اس کے پھلوں سے پوری طرح لذت آشنا نہ ہو سکے گی کم ازکم دو تین پشتیں اسکے پورے نتائج ظاہر ہونے کے لیے درکار ہیں۔ لہذا ہمیں نتائج کے لیے بے صبر نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کا نقشہ ٹھیک ٹھیک جیسا کہ ہم بنا سکتے ہیں بنادیں اور اس کی بنیادیں اٹھاکر نئی آنے والی نسل کو تعمیر کا کام جاری رکھنے کیلئے تیار کردیں اس سے زیادہ غالبًا ہم کچھ نہ کرسکیں گے۔

ائمہ مساجد کی تعلیم و تربیت کے متعلق بھی اپنے خیالات عرض کردوں۔

اسلام کے جتنے انسٹی ٹیوشن ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم اور قدیم مسجد ہے جس کی کامیابی امام کی قابلیت پر منحصر ہے مگر شاید سب سے زیادہ (Degeneration) اسی انسٹی ٹیوشن میں ہوا ہے اب امام کا مفہوم مسلمانوں کے ذہن میں یہ رہ گیا ہے کہ جو شخص کسی کام کے قابل نہ ہو وہ امامت کے قابل ہے۔ اور اسی کو امامت کرنی چاہیئے حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے امام ہی کو سب سے زیادہ قابل ہونا چاہیئے .... سردست عملًا اتنا عرض کرتا ہوں کہ اچھے اور تعلیم یافتہ اور عمدہ کیرکٹر کے اور کافی سن رسیدہ آدمیوں کا انتخاب کیجیے۔ مجردوں کی بہ نسبت شادی شدہ آدمی قابلِ ترجیح ہیں سب سے زیادہ جو چیز ان کے

ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ امام کی صحیح حیثیت ہے امام اپنی مسجد کے حلقہ اثر میں اسلام کا نمائندہ ہے اس کے اخلاق اور اس کی سیرت کو نہایت پاکیزہ ہونا چاہیے ایک معمولی درجہ کی دنائت یا ناشائستگی بھی اگر اس سے سرزد ہو تو غیروں کی نظر ہی میں نہیں، خود مسلمانوں کی نظر میں بھی اسلام کی وقعت گر جاتی ہے حتیٰ کہ لوگوں کے ایمان تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کو اپنی زندگی ایسی بنانی چاہیے کہ گویا وہ زندہ اور چلتا پھرتا اسلام ہے۔ دلوں میں اس کی عزت اور محبت جاگزیں ہونی چاہیے اور اسکی شخصیت میں کشش ہونی چاہیے وہ خود بخود اپنی بستی کا مرکز بن جائے اور اپنی مقناطیسیت سے مسجدوں کو اسلامی آبادی کا مرکز بنا دے۔ امام کا خوش آواز ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ قرآن کو دلکش طریق سے پڑھ سکے اس میں خطابت کی قابلیت بھی ضروری ہے تاکہ جمعہ کا خطبہ برجستہ دے سکے اس کا مطالعہ کافی وسیع ہونا چاہیئے نہ صرف احکام اسلامی سے خوب واقف ہو بلکہ عام معلومات بھی اسے حاصل ہوں اور ایک حد تک "لیڈر شپ" کی اچھی صلاحیتیں اسکے اندر موجود ہوں۔ فرقہ بندی میں اسکو غلو نہ ہو۔ اسے وسیع الخیال اور وقت اور زمانہ کا مزاج شناس ہونا چاہیئے ان سب باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے ادارہ سے جو لوگ تربیت پاکر جائیں وہ بعد میں بھی مرکز سے متعلق رہیں، اور اپنی اپنی بستیوں کے ایسے معاملات میں مشورہ و ہدایت کے لیے مرکز کی طرف رجوع کرتے رہیں جن میں کسی قسم کی اہمیت ہو۔"

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ابتداً میرے پیش نظر کیا اسکیم تھی میں چاہتا تھا کہ اس قسم کا ایک ادارہ میں خود حیدرآباد میں قائم کروں اور اس قسم کا ایک ادارہ یہاں قائم کیا جائے جس کو کوئی موزوں و مناسب آدمی اسی قسم کی لائینز پر چلاتا رہے۔

اس کے بعد حالات نے دفعتہً پلٹا کھایا۔ مسلمانوں کی قومی طاقت کے روز افزوں زوال اور ان کے انتشار فکر و عمل سے جس چیز کا خطرہ مجھے ایک مدت سے تھا، میری توقع کے خلاف، حالات کی رفتار اسکو یکایک سامنے لے آئی۔ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں اس خطرہ کے آثار و علائم بڑی تیزی کے ساتھ مجھ کو نظر آنا شروع ہوئے یہاں تک کہ تاریخ مذکورہ میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں، جو حالات کی حقیقی نوعیت کو سمجھ کر انہیں آنے والی تباہی سے بچانے کی کوئی صحیح اسلامی راہ پیش کرے، تو مجبوراً میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اسکو اسی انقلاب کے مقابلے

میں صرف کردوں کیونکہ اگر اسی قوم کو خراب کردیا تو پھر کسی تعمیری کام کے لیے کوئی موقعہ ہی باقی نہ رہے گا چنانچہ میں نے دہلی سے حیدرآباد پہنچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا کردی جس کے ابتدائی نشانات میرے ان مضامین میں ملتے ہیں جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اسکے متعلق میں نے ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کے خط میں چودھری صاحب کو لکھا تھا کہ :-

"اب میرے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ جس میں مجھے ہمہ تن منہمک ہونا پڑے گا۔ میں نے اس مہم کی ابتدا، محرم کے ترجمان القرآن سے کردی ہے۔ جس میں اسلامی ہند کے مستقبل پر مضامین کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ آئندہ چند مہینوں میں دیکھنا ہے کہ کتنے مددگار ملتے ہیں۔ بہرحال میں یہ تصفیہ کرچکا ہوں کہ خواہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے، میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کردوں گا، اور آخری وقت تک جاری رکھوں گا۔ قطع نظر اسکے کہ کامیابی ہو نہ ہو مسلمانوں کی اسوقت جو نازک حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے اس کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ دس بیس سال اس ملک میں اسلام کی قسمت کیلئے فیصلہ کن ہیں اگر اس وقت ہم مدافعت کے لیے کھڑے نہ ہوئے تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر ہم کوئی تعمیری کام کرسکیں۔ آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے آگ اپنے سینے میں لایا ہوں۔ اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔؟"

اس مہم کو شروع کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اب میرے لیے حیدرآباد کوئی مناسب مقام نہیں ہے پہلے جو خالص تعمیری کام میں کرنا چاہتا تھا اسکے لیے ایک ایسے گوشۂ عافیت کی ضرورت تھی جو ہنگاموں کی دنیا سے دور ہو۔ حیدرآباد اسکے لیے بہترین گوشۂ عافیت مجھے دے سکتا تھا۔ لیکن جب مجھے انقلابی طاقتوں کے مقابلے میں تنازع للبقا کے لیے اٹھنا پڑا تو میرے لیے ناگزیر ہوگیا کہ گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر اصل میدانِ مقابلہ میں جاؤں چنانچہ میں نے ۲، جون ۱۹۳۷ء کے خط میں اس کے متعلق چودھری صاحب کو لکھا۔

"میں اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اصل میدان مقابلہ شمالی ہندوستان ہے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ وہیں ہوگا اور اسی فیصلہ کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلینگے لہٰذا اب میرے لیے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں سے ہجرت کردوں اور شمالی ہند میں کسی جگہ قیام کروں لیکن دارالہجرت کے انتخاب میں ابھی متردد ہوں۔ محرم کے اشارات

شائع ہونے کے بعد سے بکثرت خطوط آرہے ہیں جن میں مطالبہ کیا جارہا ہے کہ کوئی راہِ عمل تجویز کروں۔ میں بے صبری کے ساتھ کام کرنے کا قائل نہیں۔ پورے غور وخوض کے ساتھ ایک "نقشہ جنگ" بنا رہا ہوں۔ انشاءاللہ دو تین مہینے میں یہ نقشہ مکمل ہو جائے گا اسکو شائع کرنے کے بعد من انصاری الی اللہ کی آواز بلند کروں گا، اور صرف ایسے لوگوں کو دعوت دوں گا جو وقت آنے پر یہ نہ کہہ دیں کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔"

خود چودہری صاحب نے بھی اس چیز کو اپنی جگہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ وہ اپنے ۲۵ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"جو خیر و شر ہندوستان میں پہنچا ہے اس کی پیش روی کا بوجھ پنجاب کے ذمہ ہی ہوتا ہے۔ آپ اپنا مورچہ یہاں آکر لگائیں۔ جس انقلاب کے خطرے سے آپ نے آگاہی کی ہے وہ یہاں ہی سے اٹھے گا۔ اگر آپ نے پنجاب کو دبا لیا تو پھر سارے ہندوستان کو دبا لیا۔ اس بات پر غور فرمائیں اور ایک ماہر فن جرنیل کی طرح محاذ اچھی جگہ قائم کریں۔"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں خود ہی شمالی ہندوستان کی طرف منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی میں ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف میرا ۲۰ سال کا غور و خوض اور مطالعہ تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے اس تعمیری کام کے سوا کوئی دوسری چیز کارگر نہیں ہو سکتی جس کا نقشہ میں بنا چکا ہوں دوسری طرف مسلمانوں کے پراگندہ گرد و پیش انقلاب کی تحریک تیزی کیساتھ تاخت کر رہی تھی اسے دیکھ کر میں سمجھ رہا تھا کہ اب بلا تاخیر اپنی بچی کھچی قومی طاقت کو سنبھالنا ضروری ہے، دو جتنی دیر ہم اپنے تعمیری کام کو اس حد تک ترقی دے سکیں گے کہ وہ قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو، اتنی دیر میں قوم ختم ہو جائے گی۔ اگر تعمیری کام کا وہ نقشہ آپ کے سامنے ہے جو ابھی میں بیان کر چکا ہوں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ چند آدمیوں کا قرآن و سنت اور علوم قدیمہ و جدیدہ کے عمیق مجتہدانہ مطالعہ اور خالص اسلامی تربیت سے باعتبار علم اور باعتبار مضبوطی سیرت اس قابل ہو تا کہ وہ قوم کے بگڑے ہوئے نظام تعلیم و تربیت اخلاق کو درست کریں اور پھر اس اصلاح شدہ نظام تعلیم و تربیت سے قوم میں ایسی طاقت پیدا ہو تا کہ وہ سیاسی معاشی تمدنی اور اخلاقی پستی سے ابھر سکے۔ یہ کتنی طویل مدت چاہتا ہے کم سے کم اندازہ کے مطابق اگر اسکو آج شروع کیا جائے تو یہ تیسری پشت (Generation) میں جا کر بار آور ہو گا۔ اب آپ خود ہی مجھے بتائیں کہ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس

طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سر نو تیار کریں۔ جو حالات آپکے سامنے بھی ہیں اور میرے سامنے بھی ہیں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے جسے میں دیکھتا ہوں اور آپ نہ دیکھتے ہوں ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعے کو پراونشل اٹانوی کے زبردست وسائل سے ہندوستان جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع ہو چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لئے بحیثیت مسلمان قوم ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندوستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں اور ان کی بے شمار ٹکڑیاں، بے شمار راستوں پر بھاگتی چلی جا رہی ہیں میں انتہائی رجائیت (OPTIMISM) کے ساتھ اگر اندازہ لگاؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ دس سال یہ حالت قائم رہی تو میدان کلی طور پر آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ قوم ہی باقی نہ رہے گی جس کو سنبھالنے کے لیے آپ بیٹھے ہوئے درس قرآن دیا کریں گے بلکہ وہ شاید گوشہ عافیت بھی آپ کو نہ ملے گا جہاں بیٹھ کر آپ ایسا درس قرآن دے سکیں جس میں دشمنان اسلام کو اسلامی طاقت کے اعادہ (REVIVAL) کا خطرہ نظر آئے یہی خیالات تھے جن میں اب سے دس مہینے پہلے ڈوبا ہوا تھا آخر کار شدید غور و فکر کے بعد اس فیصلہ پر پہنچا کہ خواہ میری مشکلات کتنی ہی بڑھ جائیں اور مجھ پر ذمہ داری کا بوجھ کتنا ہی ناقابل تحمل ہو جائے، بہر حال مجھ کو سیاسی جدوجہد اور قومی تعمیر کے دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہیں تاکہ میدان جو تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، سیاسی جدوجہد سے اسکو بچایا جائے اور پھر جتنا میدان ہاتھ آئے اسکو قابو میں رکھنے کے لیے تعمیری کام کے ذریعہ قوم کو تیار کیا جاتا رہے میں اس فیصلہ پر اس لیے بھی مجبور تھا کہ جب میں نے اپنے سیاسی مضامین کے ذریعے قوم میں ایک آگ بھڑکا دی، اور اس کو کانگریس اور لیگ کے درمیان ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرا دی تو اسکے ساتھ ہی مجھ پر اخلاقی فرض عائد ہو گیا کہ میں ہی وہ دوسرا راستہ بنا کر بھی دکھاؤں اور اس پر چلا کر عملاً ثابت کر دوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے۔ اس موقعہ پر میرا پیچھے ہٹنا یہ معنی رکھتا ہے کہ میں اپنی قوم سے غداری کر رہا ہوں اور اسکو اکسانے کے بعد ایسی جگہ پر جا کر چھوڑ رہا ہوں جہاں وہ پیاس تو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے مگر پانی موجود نہیں ہے یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی ہے کہ میرا ایسا خیال ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جو خطوط میرے پاس آئے ہیں ان کے بنڈل دیکھنے کی زحمت اگر آپ گوارا فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملک کے جن حلقوں تک میری آواز پہنچی ہے، وہ مجھ سے کس چیز کی توقع رکھتے ہیں کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور اگر میں نے اسکو پورا کرنے میں کوتاہی کی تو وہ مجھے کس نظر سے دیکھیں گے۔ رہی وہ جوابدہی جو مجھے خدا کے ہاں کرنی پڑے گی اس میں تو ظاہر ہے کہ میرا کوئی شریک

حال نہیں ہو سکتا۔ بہرحال چوں کہ آپ میری پوزیشن میں نہیں ہیں اسلیئے میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو اس ذمہ داری کا کہاں تک اندازہ ہے جو اس وقت مجھ پر عائد ہوگئی ہے لیکن میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھ پر اس ذمہ داری کا احساس اتنا سخت ہے کہ اسکے تقاضے کو پورا کرنے میں خواہ مجھ کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے، خواہ میری بربادی کیوں نہ ہو جائے اور خواہ مجھے اپنے عزیز ترین تعلقات ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے، میں کسی خوف یا کسی لالچ، یا کسی تعلق کی خاطر اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ نہ کسی کو مجھ سے اس کی توقع رکھنی چاہیئے۔ اور نہ میں کسی ایسے شخص یا گروہ سے تعاون کر سکتا ہوں جس سے تعاون کرنے کے لیے مجھے اپنے اس راستے سے ہٹنا پڑے۔

یہ فیصلہ تھا جس کی اطلاع میں نے اپنے ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کے خط میں چودھری صاحب کو دی اس خط کے الفاظ یہ ہیں۔

" جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے میری اسکیم یہی تھی کہ خاموشی کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر کام کے آدمی تیار کیے جائیں اور پھر ان سے کوئی بڑا کام لیا جائے لیکن یہ کام دیر طلب ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ انقلاب سر پر آگیا ہے اگر اس وقت مسلمانوں میں کوئی زندگی پیدا نہ کی گئی تو پوری جماعت ڈوب جائے گی اور جب پوری جماعت ڈوب گئی تو ہمارا اور آپ کا کہیں ٹھکانہ ہی نہ ہوگا کہ تعمیری کام کر سکیں۔ ایک طرف تو یہ پہلو ہے دوسری طرف یہ حقیقت بجائے خود قائم ہے کہ محض سطحی تحریک سے کوئی پائیدار فائدہ نہ ہوگا۔ تعمیری کام بہرحال ضروری ہے اور تعمیری کام یہی ہے کہ ایک باایمان اور فعال جماعت تیار کیجائے جو پوری قوم بنانے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اب یہ مشکل آپڑی ہے کہ وقت پہلے کام کا مطالبہ کر رہا ہے جس کے لیے فوری عمل کی ضرورت ہے اور حکمت دوسرے کام کی متقاضی ہے جو تدریجی تعمیر چاہتا ہے۔

میں کئی مہینے سے اسی فکر میں مبتلا ہوں کہ کیا کروں؟ بالآخر اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھ ہی کو یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہئیں۔ پہلے کام کے لیے میں مخلص، پُر جوش اور باعمل نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہوں جو ہماری قوم کے عوام میں جائیں اور ان کے اندر بیداری پیدا کریں اس کا مرکز شمالی ہند کا کوئی مناسب مقام ہوگا۔ رہا دوسرا کام تو اس کے لیے آپ کے ادارہ کو مرکز بنایا جائے گا اور یہاں ایک نہایت گہری اور پائیدار بنیاد پر تعمیری کام کرنے کے لیے اہل علم کی ایک جماعت تیار کیجائے

گی۔ میں ان دونوں کاموں سے اپنا تعلق رکھوں گا، اور کسی ایسی جگہ ہجرت کر جاؤں گا جہاں سے یہ دونوں تحریکیں بآسانی چلائی جا سکیں۔

جیسا کہ میں نے اپنے اس خط میں لکھا ہے۔ اس وقت میری رائے تھی کہ میں ہیڈکوارٹر کسی دوسرے مقام کو بناؤں تاکہ وہاں آزادی کے ساتھ اپنے نقشہ کے مطابق سیاسی تحریک کی ابتدا کر سکوں لیکن وہ ہیڈکوارٹر اس مقام سے قریب ہوتا کہ یہاں جو تعمیر کا کام شروع کیا جائے۔ اس سے میرا تعلق قائم رہے یہ رائے میں نے دو وجوہ سے قائم کی تھی ایک یہ کہ میں آپ حضرات کی نازک پوزیشن کو سمجھتا تھا اور مجھے نہ صرف اس بات کا خیال تھا کہ آپ کے لیے کسی ایسی تحریک سے فرداً تعلق رکھنا مشکل ہے جو کبھی حکومتِ وقت کی پسندیدگی سے محروم بھی ہو سکتی ہے بلکہ میں خود بھی آپ کو اپنے ساتھ ایسی ذمہ داری میں باندھنا پسند نہیں کرتا تھا جو کسی وقت آپ کے لیے ناقابل تحمل ہو جائے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ذاتی واقفیت اور تحقیق حال کے بغیر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ میرا تعاون ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کا نقشہ میں نے سوچا ہے جس کی تعمیر مجھ کو کرنی ہے۔ جس کا مجھ کو دنیا میں ساری قوم کے سامنے، اور آخرت میں خدا کے سامنے جواب دینا ہے اسکے بنانے اور چلانے میں مجھ کو پوری آزادی فکر و عمل حاصل ہونی چاہیئے۔ ذمہ دار بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کس طرح ادا کرے۔ انجینئر جس کو عمارت بنانی ہے خود بہتر طریقے سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بنیادیں کس طرح کھودے، اور دیواریں کس طرح اٹھائے۔ اگر نقشہ بنانے اور عمارت اٹھانے کی ذمہ داری اس پر ہو اور ایک ایک اینٹ کے متعلق یہ فیصلہ کرنے والے دوسرے ہوں کہ وہ رکھی جائے یا نہ رکھی اور اگر رکھی جائے تو کب اور کہاں رکھی جائے۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی عمارت بننی ممکن ہی نہیں۔ اور اگر کوئی عمارت بنانا ہو تو خود اس کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ ایسی مداخلت سے باز رہے۔

بس میں تحقیق کے بغیر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں مجھ کو ایسی آزادی حاصل ہو گی یا نہیں؟ گو مجھکو ایسے مددگاروں کی یقیناً ضرورت ہے جو اس عمارت کی تعمیر کا سامان فراہم کریں۔ مگر ایسے مددگاروں سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو سامان اس شرط کے ساتھ فراہم کریں کہ نقشہ عمارت اور تعمیر عمارت میں ان کی رائے فیصلہ کن ہو گی۔ درآنحالیکہ عمارت بگڑنے سے قوم کے سامنے اور خدا کے سامنے ان کا نہیں، بلکہ میرا منہ کالا ہو گا۔

بہرحال ان وجوہ سے میں یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں تامل کر رہا تھا مگر جب اکتوبر ۱۹۳۶ء

میں دہلی گیا۔ تو چودہری نیاز علی خاں صاحب از راہ کرم میرے پاس دہلی تشریف لائے اور پھر ان کے ساتھ میں یہاں حاضر ہوا اور یہاں سے لاہور جا کر علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تمام سفر کے دوران میں نے اپنے خیالات اور ارادوں سے چودہری صاحب کو پوری طرح آگاہ کر دیا اور جب ان سب سے واقف ہونے کے بعد انہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی اور یقین دلایا کہ اپنی سکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مجھ کو پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنا ہیڈ کوارٹر الگ بنانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہی جگہ دونوں کاموں کا مرکز ہو۔ اس فیصلہ کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں منتقل ہو کر آیا ہوں آپ جانتے ہیں کہ اس انتقالِ مکانی میں جو کچھ مالی بار مجھ پر پڑا ہے وہ میں نے خود برداشت کیا ہے یہاں رہنے کے لیے اور اپنا پرچہ چلانے کے لیے جتنے مصارف کی ضرورت ہوگی وہ میں خود برداشت کروں گا۔ حتیٰ کہ جب تک میں زمین لے کر اپنا مکان بناؤں اسوقت تک میں وقف کے جس مکان میں رہوں گا اس کا کرایہ بھی وقف کمیٹی کو دوں گا۔ اور انشاء اللہ ایک حبہ کسی وقت آپ کی کمیٹی سے یا آپ میں سے کسی صاحب سے اپنی ذات یا اپنے رسالے کے لیے نہ لوں گا اسکے بعد ظاہر ہے کہ اخلاقاً بھی مجھ پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے جس کی بنا پر یہاں وہ پوزیشن قبول کروں جو کسی پرائیوٹ درسگاہ کے تنخواہ دار ہیڈ ماسٹر کی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ حقیقی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر آپ خود بھی ایسی توقع مجھ سے نہ رکھیں گے۔

اب اپنی تجاویز پیش کرنے سے پہلے میں ایک فقرے میں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اولین مسئلہ جس کا آپ کو فیصلہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ عمارت میں اپنے نقشہ پر بناؤں تو مجھے کامل اختیارات دیجیئے اور اگر آپ خود بنانے کا خیال رکھتے ہیں تو مجھ سے اب بھی صاف کہہ دیجیئے تاکہ میں واپس چلا جاؤں کیوں کہ میں واپس جانے کا نقصان گوارا کر سکتا ہوں۔ مگر یہ بات میرے لیے ناقابلِ تحمل ہوگی کہ آپ ہر مرحلہ پر یہ فرمائیں کہ پہلے فلاں کام کرو، اور فلاں نہ کرو۔ اور ہم فلاں کام کرنا چاہتے ہیں اور فلاں نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے سخت طوفان کی حالت میں ایک طرف ٹوٹی ہوئی کشتی کو بچانے کی فکر ہے اور دوسری طرف نئی کشتی بنانے کی۔ اس کام میں گردوپیش کے حالات کی رفتار، مستقبل کے امکانات، مسلمانوں کی مزاجی کیفیت اور اسکے اتار چڑھاؤ، وقت کی ضروریات، اپنے ذرائع و وسائل اور ممکن الحصول رفقاء کار کی صلاحیت، غرض ان سب چیزوں پر تفصیلی نظر رکھ کر مجھ کو انتہائی جگر سوزی و دماغ کاوی کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا ہے اور ایسے اندھیرے میں اٹھانا ہے جس میں بجز اپنے دل کی روشنی کے کوئی شعاع تک مجھ کو باہر کی دنیا میں نظر

نہیں آتی۔ ایک ایک قدم جو میں اٹھاتا ہوں اسکے اٹھانے کا فیصلہ کرنے اور دوسرے قدم کا رخ متعین کرنے میں مجھے کتنا خون جگر کھپانا پڑتا ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اب اگر کوئی صاحب جن پر نہ اس ذمہ داری کا کوئی بوجھ ہے اور نہ جنہوں نے اس کام کا نقشہ بنایا ہے، میرے راستے میں آکر بیک جنبش زبان حکم صادر فرما دیں کہ اس سمت میں قدم اٹھایا جائے اور فلاں کام پہلے شروع کیا جائے اور فلاں کام کا سلسلہ ابھی شروع نہ ہو تو نہ آپ اندازہ کرسکتے ہیں اور نہ کہنے والے صاحب اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ذرا سی بات جو انہوں نے بے تکلف فرمادی، اس سے میری کتنی محنت پر پانی پھر گیا اور میرے قائم کئے ہوئے توازن میں کتنی برہمی و پراگندگی واقع ہوگئی اسکو اگر کوئی اعانت سمجھتا ہو تو میں ایسی اعانت سے باز آیا۔ مجھے معاونین کی تو بلاشبہ ضرورت ہے لیکن ایسے معاونین کی نہیں کہ ادھر مجھے طوفان سے لڑنا ہو اور ادھر میرے معاونین میرے ہاتھ پاؤں کستے رہیں۔ اگر کوئی صاحب یہ خیال رکھتے ہوں کہ وہ خود اس کام کے نشیب و فراز کو بہتر سمجھتے ہیں اور اسکے چلانے کی پوری اہلیت ان میں ہے تو وہ خود اس ذمہ داری کو قبول فرمائیں۔ ایسی صورت میں میں نہیں سمجھتا کہ میری کیا ضرورت ہے۔

یہ سوال جو میں نے آپکے سامنے بلاکسی رو رعایت اور لاگ لپیٹ کے پیش کیا ہے اس کا فیصلہ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی بلاکسی رو رعایت کے کریں اور اگر آپ تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد، جو میں نے آپکے سامنے پیش کی ہیں یہ سمجھیں کہ فی الواقع ایسی صورت میں میری یہاں ضرورت نہیں ہے تو میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اس کے اظہار میں غلط مروت سے کام نہ لیں۔ اور اس بات کی ذرہ برابر فکر نہ کریں کہ مجھے یہاں سے اٹھ کر جانے میں زحمت ہوگی۔ اس راستے میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی میں اس سے ہزار گنی زیادہ زحمتوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کرچکا ہوں اور میرے نزدیک اس چھوٹی سی زحمت کا اس وقت اٹھالینا اس سے بہتر ہے کہ بعد میں ہر ہر قدم پر مجھے روحانی اذیتیں پہنچیں اور بعد از خرابی بسیار اس چیز کا فیصلہ کروں جس کو آج بخوشی عمل میں لاسکتا ہوں۔

اب میں آپ کے سامنے ادارہ کے کام کو چلانے کی تین صورتیں اس تصریح کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک صورت آپ قبول کریں اور اس پر قائم رہنے کا وعدہ فرمائیں تب تو میں اس کے چلانے کی ذمہ داری قبول کروں گا اور اگر ان میں سے کوئی صورت آپ کو پسند نہ ہو تو کوئی چوتھی صورت میرے یہاں ٹھہرنے کی نہیں ہے۔

وقف کمیٹی جائیداد اور وقف کے انتظام کی کلیۃً مختار ہو اور نظم و نسق جائیداد کے مصارف وضع کرنے کے بعد خالص آمدنی ادارۂ بیت المال میں داخل کردیا کرے۔ رہا ادارے کو چلانا اور اسکے مقاصد کو

پورا کرنا اور بیت المال کے روپے کا مصرف متعین کرنا تو اسکے تمام اختیارات بحیثیت رکن وقف کمیٹی مجھے تفویض کر دیئے جائیں۔ میں آپ حضرات سے اور کارکنانِ ادارہ سے اور بیرونی اہل الرائے اصحاب سے جب جس مسئلہ پر چاہوں گا مشورہ کروں گا اور آپ کو حق ہوگا کہ جس وقت چاہیں مجھے کسی کام میں مشورہ دیں۔ مگر میں کسی مشورے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا پابند نہ ہوں گا۔ اور نہ کسی کی مداخلت کو گوارا کروں گا۔ البتہ آپ بیت المال میں جس قدر روپیہ داخل کریں اس کا پورا حساب طلب کر سکتے ہیں اور ماہوار، سہ ماہی، یا ہر وقت جب چاہیں حسابات کا معائنہ کر سکتے ہیں تاکہ آپ یہ اطمینان کر سکیں کہ روپیہ جائز مصارف میں صرف ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر کسی مصرف کے متعلق میرے اور کمیٹی کے درمیان اختلاف ہو کہ وہ جائز ہے یا نہیں۔ تو اس کا فیصلہ دو حکم کریں گے جن میں سے ایک میرا مقرر کردہ ہو اور ایک وقف کمیٹی کا۔ بیت المال پر مجھے پورا کنٹرول ہونا چاہیے ورنہ مجھے اختیارات دینا بالکل بے معنی ہے۔ ادارہ کی عمارات کے لیے زمین وقف کا ایک حصہ جو وقف کمیٹی کی منظوری سے میں متعین کروں گا، اسے الگ کر دیا جائے گا۔ اور اس میں ادارہ کی ضروریات کے لحاظ سے جو اور جیسی عمارت میں بنانا چاہوں گا بنا سکوں گا۔

۲

اگر یہ صورت آپ کو پسند نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ عمارات اور ان کے ساتھ زمین وقف کا اس قدر حصہ جس کی مجھے ضرورت ہے، مجھے کرائے پر دے دیا جائے اور یہاں میں اپنی ذمہ داری پر ادارہ قائم کروں۔ کمیٹی وقف کی آمدنی کو اخراجاتِ نظم و نسق وضع کرنے کے بعد ادارے کے حوالے کر دے اور وہ مصارف متعین کر دے جن میں یہ رقم صرف کی جائے۔ کمیٹی صرف اس رقم کی حد تک ادارہ سے حساب لینے کی ذمہ دار ہوگی اسکے علاوہ کسی کام سے اس کو کچھ سروکار نہ ہوگا۔ جس حصۂ زمین کو میں کرایہ پر لوں گا اس پر اگر کمیٹی چاہے تو میری تجویز کے مطابق عمارات بنا دے اور کرایہ میں اضافہ کر دے یا مجھے اجازت دے کہ میں خود اپنی ضرورت کے مطابق عمارت بنا لوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ حضرات سے قطع تعلق کرکے یہاں کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ قانونی طور پر بحیثیت وقف و بحیثیت ارکانِ مجلس وقف نہ آپ پر کسی کارروائی کی ذمہ داری ہو اور نہ آپ لوگوں کی پوزیشن میرے لیے بندِ پا بن سکے البتہ اخلاقاً آپ کی جتنی بھی ہمدردیاں مجھے حاصل رہیں اور میرے کاموں میں جتنا بھی آپ ہاتھ بٹائیں اس کا میں خیر مقدم کروں گا۔

۳

اگر اس صورت کو بھی آپ ناپسند کریں تو آخری صورت یہ ہے کہ آپ وقف کی آمدنی بھی اس ادارہ

کو نہ دیں جو میں قائم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے صرف کرایہ پر عمارات اور زمین کا ایک حصہ دے دیں وقف کی آمدنی کو آپ اغراضِ وقف کے تحت جہاں چاہیں خرچ کریں۔ ان تین صورتوں پر آپ خوب غور و خوض کر لیں اور جو صورت آپ کو پسند آئے اس کا فیصلہ کر کے مجھے دو روز کے اندر مطلع کر دیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے سوا کوئی چوتھی صورت تلاش کرنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ وہ میرے لیے کسی حال میں قابلِ قبول نہ ہوگی۔

اس امر کی تصریح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رسالہ "ترجمان" میں نے ذاتی سرمایہ سے نکالا ہے اور اپنی ذاتی ذمہ داری پر نکال رہا ہوں۔ اسلئے اس کا تعلق کسی مجلس سے نہ ہوگا نہ اس کی پالیسی میں دخل دینے کا کسی کو حق ہوگا نیز اس کے علاوہ اپنی جو کتابیں شائع کروں گا ان کا بھی کسی مجلس سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

ابوالاعلیٰ

(۴ صفر ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء)

بقیہ 'توحید عملی کے انفرادی و اجتماعی تقاضے'

پہنچی ہے ــــ اس مختصر سے مقالے میں اس عظیم سورۃ کے جملہ مضامین کا احاطہ ممکن نہ تھا میں نے محض چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ اقامتِ دین کا مضمون اس سورۃ میں کتنے مختلف اسالیب میں بیان ہوا یہ الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ زمر تا سورۃ شوریٰ، ان چار مکی سورتوں میں توحید عملی یا توحید فی الطلب کا مضمون ایک خوبصورت تدریج کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ انفرادی سطح پر توحید عملی کا جو تقاضا ہے "عبادتِ رب اور اخلاص فی الدین" اس کا مفصل ذکر سورۃ زمر میں ہے۔ پھر سورۃ مؤمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ عبادت کے جوہر اور مغز یعنی دعا کو مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل ہے ــــ بقیہ دو سورتوں یعنی حم السجدہ اور سورۃ شوریٰ میں توحید عملی کے ان تقاضوں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق اجتماعی سطح سے ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین۔ دعوت الی اللہ مرکزی مضمون ہے سورۃ حم السجدہ کا اور اقامتِ دین پر مفصل بحث ہے سورۃ شوریٰ میں جہاں توحید عملی کا مضمون اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ آخر میں میں آپ سب حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس طویل مقالے کو پورے اطمینان و سکون سے سنا ــــ وما توفیقی الا باللہ